میرے مشاہدات و تجربات

جناب سید اسعد گیلانی صاحب

(۲)

تجربات

میں نے پچھلے شمارے میں ناگوار اور تلخ مشاہدات میں سے چند ایک کا ذکر بطور نمونہ کر دیا ہے۔ اب ہم چند تجربات کی بات کرتے ہیں۔

۱ — دُنیا میں سب سے پہلا تجربہ یہ ہوا کہ غم و الم اور دُکھ درد ہر انسان کی خالص ذاتی متاع ہے جو ناقابلِ انتقال اور ناقابلِ تقسیم ہے۔ ہر الم کا دُکھ اور ہر زخم کا درد انسان کو خود ہی سہنا ہوتا ہے۔ اس میں دوسرا کوئی چاہے بھی تو شریک نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ یہ دونوں احساسات خالص داخلی اور ذاتی ہیں۔ تسلّی، تشفی، سکون بخش خارجی عوامل ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن وہ نہایت کمزور ہوتے ہیں۔ حقیقی الم وہی سہتا ہے جسے غم لاحق ہوتا ہے اور حقیقی درد اُسے ہی محسوس ہوتا ہے جسے وہ زخم لگتا ہے۔

---

۲ — دنیا میں مجھے دوسرا تجربہ یہ ہوا کہ لوگوں کے لیے سب سے زیادہ ناگوار چیز اختلاف رائے ہے۔ جس کو بھی ناراض کرنا ہو اس سے اختلاف رائے کر کے دیکھ لیجیے۔ اختلاف رائے کو کوئی برداشت نہیں کرتا۔ حکمرانوں سے کریں تو وہ جیل میں

ڈالے ہیں۔ جماعتوں میں کریں تو وہ پیچھے دھکیلتی اور کونے میں لگانے کی کوشش کرتی ہیں۔ بزرگوں سے کریں تو وہ بے ادب شمار کرتے ہیں۔ امراء سے کریں تو وہ رزق سے محروم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چھوٹوں سے کریں تو وہ لاپرواہی، عدم دلچسپی اور عدم توجہ کا رویہ اختیار کرتے ہیں بغرض اختلاف رائے جسے دنیا کی ترقی اور خوشحالی کے عوامل میں شمار کیا گیا ہے اگر حدود و ضوابط کی پابندی نہ ہو تو اسے کوئی بھی پسند نہیں کرتا جب کہ یہی اختلاف رائے ترقی اور مادی خوشحالی کے بنیادی عوامل میں شمار کی جاتی ہے۔ انسانی تجربہ سب سے کڑوی چیز تنقید اور سب سے شیریں چیز خوشامد کو ظاہر کرتا ہے۔ جب کہ ان دونوں کے نتائج متضاد اور مختلف ہوتے ہیں۔ اسلام نے تنقید کرنے والے کی بات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے اور خوشامد کرنے والے کے منہ میں خاک جھونکنے کی تعلیم دی ہے لیکن اس پر عمل کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔

۳۔ ایک تجربہ یہ ہوا کہ انسان چونکہ اجتماعیت پسند ہے اس لیے اسے غیر اصولی اجتماعیت کے اندر بھی اپنی ایک اصولی اجتماعیت بنا کر ہی رہنا چاہیے۔ اگر وہ تنہا رہنے کی کوشش کرے گا تو اسے بہت چرکے لگیں گے۔ اگر وہ اپنے ہم خیالوں کا ایک گروہ بنا کر یا کسی ایسے گروہ میں شامل ہو کر جو اس کے ایمان و مقاصد کے مطابق ہو، ان کے درمیان رہے گا تو یہ ہم خیال اس کے لیے حصار کا کام دیں گے اور وہ ان کے لیے حصار ہوگا۔ یہی ہمدردی کا حصار اسے مشکل وقت میں دشواریوں سے بچائے گا۔ اور دکھ درد میں ہمدردی کا اظہار کرے گا۔ اور مخالفوں کے مقابلے میں رعب و دبدبہ کا ذریعہ ہوگا۔ اس داخلی اجتماعیت کی ایک فطری مثال خاندان بھی ہے جسے یورپ نے تباہ کر کے افراد کی کمزوری کے درد کو اور بھی زیادہ دردناک بنا دیا ہے، مگر واضح رہے کہ خاندان ایمانی اور اصولی ساخت نہیں رکھتے

انسانوں کی برادری میں اس اجتماعیت کی ایک نہایت درجہ وسیع صورت ہمارا

ملک پاکستان بھی ہے جسے مسلمانوں نے منفی اور مثبت دو جذبات کے تحت حاصل کیا تھا۔ منفی جذبہ بھی ایک لازمی اور ناگزیر ضرورت ہے۔ جب تک لَا اور اِلَّا کی منفی اور مثبت دونوں قوتیں آمنے سامنے نہ آئیں کوئی زوردار قوت وجود میں نہیں آتی۔ کلمہ طیبہ میں تمام خداؤں کی نفی کی قوت سے ہی اللہ تعالیٰ کے وجود کا اثبات ہوتا ہے۔ اس صورت میں کلمہ طیبہ ایک جہاتی قوت کا نشان بن کر نمودار ہوتا ہے۔ پاکستان بھی جابر اور ظالم کفار کے ظلم وجور کی نفی کے جذبے اور اسلامی نظام کے مثبت جذبے کے زور سے وجود میں آیا تھا پوری قوم میں ان دونوں جذبات کی شدت نے اتنی قوت پیدا کر دی تھی کہ ہر قسم کے سروسامان سے محرومی کے باوجود برصغیر کی ملتِ مسلمہ ایک علیحدہ خطۂ زمین حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی اور آج قوموں کی برادری میں پاکستان کی اجتماعیت ہماری زندگی اور آزادی کی ضمانت ہے۔ اگر ہم کفر کے مقابلے میں جذبہ نفی اور اسلام کے حق میں جذبۂ اثبات کو آج بھی اُسی قوت سے مجتمع کریں تو پاکستان دنیا کی عظیم قوت بن سکتا ہے۔

۴۔ میں نے ادب کے میدان میں ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر نگارشات کا آغاز کیا تو اس دائرے میں بہت سی واہ واہ سے واسطہ پڑا لیکن زندگی کے گہرے مطالعہ کے بعد ایک خاص موڑ پر پہنچ کر جب میں نے ادب کی ترقی پسند تحریک کو اشتراکی نظریات کی علمبردار تحریک ظاہر کیا جو اسلامی تصوّرات سے متصادم تھی تو مجھے اپنے اس حلقۂ احباب میں سخت مذمت اور مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ مجھے تجربہ ہوا کہ ادب میں واہ واہ اور مذمت دونوں ہی اضافی چیزیں ہیں۔ درحقیقت نظریات کی یگانگت کی بنا پر لوگ واہ واہ کرتے نظریات کے اختلاف کی بنا پر مذمت کرتے اور جس کے نظریات کا علم نہ ہو اس کے بارے میں خاموشی اختیار کرتے ہیں۔ تعریف و مذمت کا بیشتر انحصار نظریاتی موافقت و مخالفت پر ہے۔ یہ دو نظریات کا دَور ہے اور محض ادب برائے ادب کی بات پرانے زمانے کی بات ہے۔

---

۵ — اکتوبر ۱۹۳۹ء میں سانکلی اسٹریٹ نمبر ۳ بمبئی کی ایک گلی میں عشاء کی نماز کے بعد مسلم لیگ کا جلسہ ہو رہا تھا۔ بمبئی میں یہ مسلمانوں کا محلہ تھا۔ میں اُس وقت نویں جماعت کا طالب علم تھا، اور بڑے جوش و خروش سے دریاں کرسیاں اور اسٹیج سجانے کے انتظامات میں مصروف تھا۔ اس چھوٹے سے محلے کے چھوٹے سے جلسے میں صوبائی مسلم لیگ کے صدر مسٹر ابراہیم اسماعیل چندریگر، سردار عبدالرب نشتر، مولانا شوکت علی، مولانا عرفان، مولانا جمال میاں فرنگی اور خود قائداعظم بھی تشریف لا رہے تھے۔ ہم لوگوں پر مسلمانوں کے جداگانہ وجود کا احساس غالب تھا۔ جوش و خروش کے لحاظ سے مولانا جمال میاں فرنگی محل کی تقریر اور جذبۂ خلوص و متانت کے لحاظ سے قائداعظم کی تقریر ہمیں بہت پسند آئی۔ میں اس سرور کو آج بھی فراموش نہیں کر سکتا ہے جب قائداعظم نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا:

”ہم محمد رسول اللہ کی اُمت ہیں۔ ہم ہر لحاظ سے ایک علیحدہ قوم ہیں اور ہمارا قانون قرآن ہے“۔

سیاست میں دین کا یہ واضح اثر میرے لیے انتہائی سرور انگیز تجربہ تھا جس کی شیرینی اب تک محسوس ہوتی ہے اور قائداعظم کے جذبہ و خلوص اور خدمتِ اسلامی کی گواہی دیتی ہے۔

---

۶ — پرکاش چندر میرا بڑا گہرا دوست تھا اور دہلی سیکرٹریٹ کے دفتر میں میرے سامنے کام کرتا تھا۔ لاہور کا رہنے والا تھا۔ اپنے آپ کو انتہائی آزاد خیال اور تنگ نظری سے دُور ظاہر کرتا تھا۔ وہ چند دنوں سے میرے پیچھے پڑا ہوا تھا کہ مجھے جامع مسجد کی سیڑھیوں کے کباب بہت پسند ہیں، تم بھی میرے ساتھ چلو تو مل کر کھائیں۔ میں مسلسل ٹالتا رہا اور وہ ہمیشہ تقاضا کرتا رہا۔ ایک بار ہم دریا گنج کی طرف سے میرٹھ کے آ رہے تھے کہ وہ بضد ہو گیا چنانچہ ہم جامع مسجد کی سیڑھیوں کے پاس کبابیوں کے پاس چلے گئے اور کباب کھائے۔ گھر واپس آتے ہوئے اس نے یہ کہہ کر مجھے چونکا دیا۔ ”مسٹر گیلانی آپ نے دھوکے سے مجھے بڑا

گوشت کھلا کر میرا مذہب خراب کیا ہے۔ میں اس کی شکایت اپنے دفتر میں بھی کروں گا اور آریہ سماج کے دفتر میں بھی"۔

"میں نے تو تمھیں کچھ نہیں کھلایا تم خود ہی بضد تھے۔ تم خود وہاں گئے، پیسے بھی تم نے خود ادا کیے" میں نے جواباً کہا۔

"نہیں میں نہیں جانتا تم ہی مجھے بڑے گوشت کی دکان پر لے گئے تھے اور تم ہی اس کے ذمہ دار ہو"۔ اس نے پھر تکرار کے ساتھ دہرایا۔ چنانچہ اس نے دفتر میں میرے خلاف یہ شکایت لکھ کر دی اور پھر نامعلوم کہاں کہاں وہ اس بات کو پھیلاتا پھرتا رہا۔

اس سے مجھے یہ تجربہ ہوا کہ ہندو کا کبھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے وہ بےحد مکار ہوتا ہے۔

۷- سردار لال سنگھ روپڑ (مشرقی پنجاب) کا رہنے والا تھا اور دہلی سیکرٹریٹ میں میرے ساتھ دفتر میں کام کرتا تھا۔ تشکیلِ پاکستان کے لیے تحریک زوروں پر تھی اور پاکستان ہر شخص کی زبان پر سب سے اہم موضوع تھا۔ میں شب و روز سردار لال سنگھ سے پاکستان، خلافتِ راشدہ، عمر فاروق کا دور، اسلام نظامِ مملکت، اسلامی حکام کی خدمت اور کردار کی باتیں اور مثالیں پیش کیا کرتا تھا۔ اور اسلامی معاشرے میں مساوات، اخوت، معاشی فراغت، غریبوں کے بارے میں احساسِ ذمہ داری اور خلفائے راشدین کے خدمتِ خلق کے کارنامے بیان کیا کرتا تھا اور اس سے کہا کرتا تھا کہ سکھوں کو بھی پاکستان میں ہی شامل ہونا چاہیے۔ ایک دن سردار سنگھ نے مجھ سے کہا۔

"گیلانی صاحب، جس پاکستان کی تصویر آپ پیش کرتے ہیں اگر وہ ایسا ہی ہوگا تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسے پاکستان میں لال سنگھ سر کے بل چل کر حاضر ہونا اور اس کی سڑکوں پر اپنے کیس اور داڑھی سے جھاڑو دینا بھی قابلِ فخر سمجھے گا۔ اے کاش کہ پاکستان ایسا ہی ہو تو وہ انسانیت کے لیے جنت کا نمونہ ہوگا اور لوگ اسے دیکھنے کو آئیں گے"۔

اب میں سردار لال سنگھ سے کہی ہوئی اپنی باتوں کو یاد کرتا ہوں تو شرمندہ ہو جاتا ہوں - وہ اگر کبھی ننکانہ صاحب زیارت کے لیے پاکستان میں آیا ہوگا تو میری باتوں کے بارے میں اس نے کیا سوچا ہوگا ؟ میرے احساس کی تلخی کا تجربہ آج بھی اس واقعہ کی یاد سے وابستہ ہے -

---

مرحوم مشرقی پاکستان میں اکثر سیلاب آیا کرتے تھے - ۱۹۵۴ء کے سیلاب بہت خوفناک تھے، جن میں امداد کے لیے مغربی پاکستان سے میں بھی ایک امدادی کیمپ میں رضاکار کے طور پر گیا تھا - سیلابوں کے بعد تبلیغ اور تنظیم کے سلسلے میں میں وہاں ٹھہر گیا - اپنے ایک "مکتوب مشرقی پاکستان" میں جو ماہنامہ چراغ راہ کراچی میں چھپا تھا میں نے اپنا یہ مشاہدہ بیان کیا تھا کہ مشرقی پاکستان اور بھارت کی سرحدیں کھلی ہونے کے سبب کثرت سے لوگ سمگلنگ کے کاروبار میں مصروف ہیں جس کا بُرا اثر مشرقی پاکستان کی معیشت پر پڑتا ہے - تقریباً بیشتر جیوٹ بہت ہی سستے داموں بنیے خرید کر بھارت لے جاتے ہیں - اسی سلسلے میں میں نے بہار کے مہاجرین کا ذکر بھی کیا کہ بنگال کے ساتھ بہار کی سرحدیں ملنے کے سبب بہاری مہاجر بھی کثرت سے بھارت آتے جاتے ہیں - اور سمگلنگ کی بہت سی صورتوں میں سے یہ آمد و رفت بھی ایک صورت بن جاتی ہے - میرے اس مطبوعہ مکتوب کی بے شمار نقول کر کے فتنہ پرور لوگوں نے سید پور میں پھیلائیں جو بہاری مہاجروں کا شہر تھا - اور ان دنوں میری رہائش بھی وہیں پر تھی - چنانچہ سارے شہر میں میرے خلاف دستی پوسٹر لگے - اخباروں میں غم و غصہ کے بیان چھپے اور میرے مکان پر رات کو شرابیں پی کر مظاہرہ کیا گیا -

اس ہاؤ ہو میں بعض احباب نے مشورہ دیا کہ مجھے کچھ دنوں کے لیے شہر چھوڑ دینا چاہیے لیکن میں نے احباب سے کہا کہ وہ ایک کھلے جلسے کا اہتمام کریں - چنانچہ میونسپل پارک میں جلسے کا اہتمام ہوا اور سارے شہر میں اعلان کر کے میں نے ایک بھرپور جلسے سے ایک گھنٹہ خطاب کیا - چند مخالفانہ نعرے بھی لگے لیکن جلسے کے بعد سارے شہر کی

فضا بدل گئی اور لوگوں نے اس صاف گوئی اور جرأت کی تعریف کی، جو اُن کی توقع کے خلاف رونما ہوئی تھی۔ اس سے مجھے تجربہ ہوا کہ مخالفت میں فرار کی بجائے جرأت سے مقابلہ کیا جائے تو اس کے اثرات خوشگوار ہوتے ہیں۔

بلاشبہ اس زندگی میں ہر انسان بے شمار مشاہدات و تجربات سے گزرتا ہے لیکن اس نامکمل دُنیا کی فانی اور نہایت درجہ محدود زندگی کے مشاہدات و تجربات کی حقیقت ہی کیا ہے؟ انسان کی ہستی کا جو تناسب اس وسیع و عریض کائنات میں ہے اس کی حیثیت ایک عظیم الشان صحرا میں حقیر ترین ذرّے اور بحرِ بے کنار میں حقیر ترین قطرے سے بھی کم ہے۔ اَن گنت کہکشانوں کی کائناتی وسعت میں جہاں ہزاروں نظام ہائے شمسی دریافت ہو چکے ہیں ان نظام ہائے شمسی میں سے ایک چھوٹے سے نظامِ شمسی کے اربوں سیاروں میں ہماری زمین ایک حقیر سے ڈھیلے کی حیثیت رکھتی ہے جو کروڑوں مربع میل پر مشتمل ہے۔ اس کا بھی محض ایک چوتھائی حصہ آباد ہے جو اربوں انسانوں کی قرارگاہ ہے۔ ان اربوں انسانوں کی لامحدود آبادیوں کے محلوں، شہروں اور گلیوں میں اَن گنت انسان نامعلوم تشخص کے ساتھ رہتے ہیں جن میں سے ہر ایک کی حیثیت اس وسیع کائنات میں ایک خلیے سے بھی کم ہے۔ ظاہر ہے کہ کائنات کے اس وسیع سلسلۂ تخلیق میں ایک بے حیثیت خلیے جیسے انسانی وجود کے مشاہدات و تجربات کا کیا تذکرہ کیا جا سکتا ہے جو محدود ترین علم اور انتہائی سطحی مشاہدہ رکھتا ہے۔

حقیقی تجربات تو وہی ہیں جو خالقِ کائنات نے اپنی کتابِ ہدایت میں قوموں کے عروج و زوال اور ان کے اسباب کے تذکرے میں خود بیان کیے ہیں اور حقیقی مشاہدات بھی وہی ہیں جو مالکِ کائنات نے مظاہرِ فطرت کا تذکرہ کرتے ہوئے انسانی فکر و نظر کے دریچے کھولنے کے لیے بیان کیے ہیں۔ اسی قرآنِ ہدایت اور فرقانِ سعادت میں انسانیت کے لیے سیدھا راستہ موجود ہے اور ہم سب اسی سیدھے راستے کی متلاشی اور اسی کی رہنمائی کے محتاج ہیں۔